بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

شیطٰن ہمیشہ اس کوشش میں مصروف رہا ہے کہ دین اور سیاست کو باہم متحد ہونے سے روکے اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ کشمکش لاکر ایسے حالات پیدا کردے کہ دونوں کبھی ایک نہ ہو سکیں، اور دین سیاست سے دب کے رہے۔ بخلاف اس کے انبیاءِ الٰہی نے ہمیشہ اس امر کے لئے جدوجہد کی ہے کہ دین و سیاست کو ایک کردیں، اور اس طرح ایک کردیں کہ دین سیاست کا عنان بردار بن جائے اور سیاست کی ہر حرکت دین ہو۔

اس مقصد کے لئے کامیاب ترین کوشش وہ تھی جو نبی صلعم کے لدائے قیادت کے تحت شروع ہوئی اور جس کے نتیجے میں مدینہ کا اسٹیٹ وجود میں آیا۔ اس اسٹیٹ کی پوری سرگرمیوں کے مجموعے کا نام دین تھا۔ اور اس میں دین کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ یہ اسٹیٹ دورِ نبوت میں جن بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ خلافتِ راشدہ نے ٹھیک انہیں بنیادوں پر اسے ارتقا دیا۔

لیکن آگے چل کر اسلامی مملکت کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی جنہوں نے خلافت کو وراثتی بنا کر گاڑی کا رُخ صحیح سمت سے موڑ دیا۔ اور یہی تبدیلی آگے چل کر ایک بہت بڑے اختلال اور فتنے کی صورت اختیار کر گئی۔ خلافت موروثی بنتے ہی ملوکیت میں بدل گئی اور اس میں وہ تمام علامات و آثار ابھر آئے جو ہمیشہ سے ملوکیت کے لئے مخصوص چلے آئے ہیں۔ گاڑی اور آگے چلی تو پھر نابالغ بلکہ شیر خوار بچوں کو ولی عہد بنا کر اُن کی بیعت لینے کا رواج شروع ہوا۔ یہ افسوسناک بدعت ہارون الرشید نے اپنی بیگم زبیدہ کے مشورے سے اختیار کی، چنانچہ ایک شاعر نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے چند اشعار لکھے جن کا ماحصل یہ تھا۔

کہ ہم سے نابالغ بچوں کی ولیعہدی کی بیعت ایسے حال میں لی جاتی ہے جبکہ اُن کو پیشاب کرانے سے ابھی ان کی مایہ فارغ نہیں ہو سکتی۔

نابالغ بچوں کی ولیعہدی نے وزارت کی اہمیت بڑھائی، یہاں تک کہ خلافتِ فاطمیہ کے زوال کے وقت وزارت سلطنت پر قابض ہو گئی اور خلافت کو اُس نے ایک جداگانہ منصب کی حیثیت دے دی۔ یہاں سے دین اور سیاست کی تفریق کے نظریئے کو عملاً اپنا لیا گیا۔ دین کا عنان بردار خلیفہ کہلاتا تھا اور سیاست کا سربراہ کار سلطان قرار پایا جس کے لئے "السلطان ظل اللہ" کو نہایت بے جا طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

۶۵۹ھ میں جب مصر میں خلافتِ عباسیہ کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تو اُس وقت نظامِ حیات میں یہ ثنویت (Dualism) پوری طرح راہ پا چکی تھی۔ آگے چل کر بظاہر اس ثنویت کا خاتمہ کیا گیا اور خلافت و سلطنت کو پھر یکجا کرنے کا سوانگ رچایا گیا، لیکن خلافت کا جوہر ایک مدت سے ختم ہو چکا تھا اور نری سلطنت باقی تھی۔ دین قصرِ حکومت سے رخصت ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ اب چند دنیا پرست مولویوں اور مفتیوں کے لئے درباری کے مناصب باقی تھے۔

وہ دن اور آج کا دن، ملتِ اسلامیہ اپنی اجتماعی زندگی میں دین و سیاست کو کبھی جمع نہیں کر سکی۔ دونوں کو ایک کر دکھانا تو بہت بڑا معرکۂ مردانہ ہے: اس بیچ کے سارے عرصے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہوا ہے وہ صرف اتنا تھا کہ سیاست نے دین کے نام کو، دین کی اصطلاحات کو عوام کے دینی جذبات کو استعمال (Exploit) کیا ہے، لیکن اُس نے دین کی اطاعت کبھی قبول نہیں کی۔

عین اس حالت میں کہ سیاست نے دین کو زندگی کے میدان سے دھکیل کے باہر نکال رکھا تھا۔ مغربی فلسفۂ سیاست، اور مغربی امپیریلزم کا دور ہمارے اوپر مسلط ہو گیا۔ اس دور نے ذہنی طور پر دین و سیاست کی علیحدگی کے تصور کی جڑیں بہت گہرائی تک اتار دیں، اور مادہ پیچے ساحرِ فرنگ کے کمالِ فن کی کہ اُس نے بے شمار مسلمان وکلاء اپنے لغو نظریئے کی تبلیغ کے لئے تیار کر دکھائے۔ دوسری طرف اُس نے حکومت و سیاست کا کام چلانے کے لئے ذہین لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر ایسی تربیت دی کہ دین و

سیاست کی وحدت کا تصور ان کے دل و دماغ میں کسی جانب سے نہ اتر سکے، جیسے ٹیڑھے سوراخ میں کوئی سیدھی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ جس فضا میں آج ہم جی رہے ہیں —— اور کئی قرنوں سے جی رہے ہیں —— اس میں اگرچہ بعض بلند پایہ مفکرینِ اسلام کی کوششوں سے دین و سیاست کے ایک ہونے کے چرچے عام ہیں، لیکن اس کے باوجود موجودہ فضا اُس تصور کے پنپنے کے لئے حد درجہ ناسازگار ہے۔ یہ فضا ہمہ تن اُن آثار سے پٹی پڑی ہے جو ذہنوں کو خواہ مخواہ دین و سیاست کی تفریق کے تصور کی طرف دھکیلتے ہیں ستم یہ کہ بڑے بڑے علمائے دین اور سربراہ کارانِ سیاست عملاً اسی تصور کا شکار ہیں۔ دین و سیاست کی تفریق کے تصور نے جو گہرے اثرات ہمارے ماحول پر ڈال رکھے ہیں۔ اُن کا اندازہ کرنے کے لئے حسب ذیل مظاہر پر نگاہ ڈالئے :-

۱- آپ بے شمار ایسی دینی جماعتوں کو کام کرتے ہوئے دیکھیں گے جن کی طرف سے دستوری طور پر یہ تصریح کی جاتی ہے کہ ہمارا تعلق سیاست سے نہیں ہوگا۔ بلکہ ہم صرف امور مذہبی سے واسطہ رکھیں گے۔ دوسری طرف سیاسی پارٹیوں کا آپ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے ہاں ممبرشپ، نظم جماعت، قیادت اور طریقِ کار کے طے کرنے میں دین کو کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ سیاسی کارکن دینی امور کو "مولویوں" کے لئے مخصوص ٹھہراتے ہوئے ایک خاص طرز حقارت کا مظاہرہ کرتے ملیں گے۔

۲- آپ اسکولوں اور کالجوں میں دیکھیں گے کہ اوّل تو تعلیمِ دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اب اگر اس کا آغاز ہو رہا ہے تو اس طرح کہ "دینیات" پورے نظامِ تعلیم کا ایک ایسا چھوٹا سا جزو ہے جو دنیوی تعلیم سے قطعی طور پر بے تعلق ہے۔ نصابِ دینیات اور نصابِ دنیویات بھی اور معلّمِ دینیات اور معلّمانِ دنیویات بھی بالکل الگ الگ اور ایک دوسرے کی ذمہ داریوں سے بے تعلق ہیں۔ تعلیم گاہوں کا ماحول بھی "دینیات" کے سانچے میں نہیں بلکہ دنیویت (Secularism) کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

بعینہٖ اسی طرح دینی مدارس میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ دینی علوم کو دنیا کے بڑے بڑے اجتماعی اور عملی مسائل سے بالکل الگ کر کے پڑھایا جاتا ہے، اور جو طلباء دین کے لئے زندگیاں وقف کرتے ہیں

وہ سائنس، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، سیاست، معاشیات، حفظانِ صحت اور معلوماتِ عامہ کے لحاظ بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں، کیونکہ ہمارا مذہبی نظامِ تعلیم ان علوم کو دینیات کے دائرے سے باہر جگہ دیتا ہے۔

۳۔ عدالتوں میں آپ دیکھیں گے کہ ملکی قانون کے سارے شعبے کتاب و سنت سے پوری طرح آزاد ہیں، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کا پرسنل لا رتھی کر دیا گیا ہے۔ وہ ہے دنیا کا قانون، اور یہ ہے دین کا قانون! دونوں میں سے فوقیت دنیا کے قانون کو حاصل ہے اور دین کا قانون اس کے تابع ہو کر کام کرتا ہے۔

۴۔ دین کے بڑے بڑے خدام کی طرف سے حکمران طاقت کی خدمت میں برابر یہ درخواست پیش ہوتی رہتی ہے کہ ہمیں شیخ الاسلام بنا دیا جائے اور ہمارے تحت ایک محکمۂ امورِ مذہبی قائم کر دیا جائے، رہے ریاست کے باقی شعبے تو وہ "السلطان ظل اللہ" کے ہاتھ ہی میں رہنے چاہئیں جس کے قبضے میں وہ اب ہیں۔ یعنی "شیخ السیاست" خدا ہوگا اور "شیخ الاسلام" خدا! انا للہ وانا الیہ راجعون!
خود ادارۂ تعلیماتِ اسلامیہ کی حیثیت ایک شیخ الاسلام ہی کی سی ہے۔ ملک کی اصل حکمران قوت ہے دستور یہ یا پارلیمنٹ اور ادارۂ تعلیماتِ اسلامیہ امورِ مذہبی کے لئے مشیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ "سلطان" ہے تو یہ "خلیفہ"، وہ سیاست کی نمائندہ ہے تو یہ دین کی، لیکن دونوں کے اختیارات اور دونوں کا مرتبہ برابر نہیں ہے۔ بلکہ دین کے کارپرداز سیاست کے جنّاتی ہواروں کے لئے جعلھم اللہ تحت ایدیکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقتدار اہلِ سیاست کے ہاتھ میں ہے۔ اور فتوے اور مشورے دینے اور سفارشات پیش کرنے کا حق ادارۂ تعلیماتِ اسلامیہ کو حاصل ہے۔

۵۔ آپ عام معاشرتی فضا کو دیکھئے تو اس میں آپ یہ پائیں گے کہ دین اور سیاست کے دائروں میں کام کرنے کے لئے بالکل الگ الگ دو طبقے موجود ہیں اور ان طبقوں میں صرف بُعد ہی نہیں بلکہ منافرت تک پائی جاتی ہے۔ دونوں کی زبان، اصطلاحات، لباس، رسوم و عادات اور معاشرت بالکل جداگانہ اور دونوں کے حلقہ ہائے کار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک طبقے کا آدمی دوسرے میں جائے تو اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ اور دوسرے طبقے کا آدمی پہلے میں پہنچ جائے تو اس کا مذاق اڑایا

جاتا ہے۔ اہل سیاست دینی طبقے کو دنیوی امور کے لئے نااہل قرار دیتے ہیں اور اہل دین سیاسی کارفرماؤں کو دینی مسائل میں ناکارہ یقین کرتے ہیں اور دونوں نے باہمی تعاون سے کام کرنے کا کوئی ثبوت ابتک نہیں دیا۔

۶۔ زندگی کی قیادت کو بھی ہم بالکل دو حصوں میں منقسم دیکھتے ہیں۔ دنیوی مسائل میں ہمارے رہنما خالص دنیوی لوگ ہیں جن کو دین کے مبادیات کا علم بھی نہیں ہے۔ اور ان کی عملی زندگی دین کے مظاہر سے پاک ہے۔ دوسری طرف مذہبی معاملات میں ہماری رہنمائی کی باگ ڈور خالص مذہبی لوگوں کے قبضے میں ہے جن کو دنیوی معاملات کی گتھیوں میں اترنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ محلے کی مسجد میں ہم جس آدمی کو نماز کا لیڈر بناتے ہیں، وہ ہمیشہ زندگی کے عام عملی مسائل میں کورا ہوتا ہے۔ اور جسے محلے کا چوہدری بناتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ ہم اسے مسجد کا لیڈر بنا سکیں۔

۷۔ ہمارے ملک کا لٹریچر بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ مذہبی لٹریچر بالکل جدا ہے اور اس کے اسالیب بالکل خاص قسم کے ہیں۔ اس کے برعکس دنیوی لٹریچر بالکل الگ ہے اور اس کے اسالیب بھی جداگانہ ہیں۔ ہمارا مذہبی ادب اس نئے انداز تحریر سے پیچھے ہے جس میں آج کا ذہن بات کو آسانی سے بیان کرتا اور سمجھتا ہے اور ہمارا نظم و افسانہ کا ادب اس فکر سے کوسوں دور ہے۔ جسے پھیلانا اسلام کی طرف سے مسلمان ادیبوں پر واجب ہے۔

یہ ہیں دین و سیاست کی تفریق کے وہ عملی مظاہر جن کی جڑیں ہمارے ذہنوں میں اتری ہوئی ہیں۔ اور جن کی شاخیں زندگی کی پوری فضا میں پھیلی ہوتی ہیں، ہم اسی شجر خبیثہ کے سائے میں آنکھیں کھولتے ہیں، تربیت پاتے ہیں، پروان چڑھتے ہیں اور ایک خاص زاویۂ نگاہ لے کر زندگی کی عملی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ اسی کے زیر اثر ہم میں سے دنیوی لوگ ہوں یا دینی دونوں اپنی پوری ذہنی اور عملی زندگی سے دین و سیاست کی تفریق ہی کی شہادت پیش کرتے ہیں —— اور اس پر ستم یہ بھی ہے کہ زبانوں سے دین و سیاست کے ایک ہونے کا اعلان بھی کیا جاتا ہے۔

اس فضا میں جماعت اسلامی انبیاء کے مشن کی خادم بن کر اٹھی ہے اور وہ دین و سیاست کو عملاً

ایک کر دینے کا ایک پروگرام اختیار کئے ہوئے ہے۔ وہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں مروّجہ ثنویت (Dualism) کو گوارا کرنے پر تیار نہیں ہے، بلکہ یہ ثنویت جہاں کہیں جس شکل میں پائی جاتی ہے، جماعت اسلامی کی اُس سے جنگ ہے۔

جماعت اسلامی یکسر دین کو لے کر اٹھی ہے۔ اور وہ اس میں غیر دین کی ذرہ بھر آمیزش کی بھی روادار نہیں ہے، لیکن اُس کا دین ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سیاست ہے اور وہ کہیں بھی سیاست سے الگ نہیں۔ بالفاظ دوسرے لفظوں میں وہ ایک ایسی سیاست کی علمبردار ہے جو ہمہ تن دین ہے اور وہ کہیں سے بھی دین کی تعریف سے خارج نہیں ہوتی۔

جماعت اسلامی کے حلقے میں علمائے دین اور جدید تعلیمیافتہ حضرات دونوں باہم متعاون ہو کر بلکہ پوری طرح یکسو ہو کر ایک نصب العین کے لئے کام کر رہے ہیں، اور اس کی قیادت ایسے بہترین افراد کے ہاتھوں میں ہے جو دینیات اور دنیویات دونوں پر نظر رکھنے کی صلاحیتوں سے آراستہ ہیں۔ وہ تمام دنیوی مسائل کو اپنے دائرۂ عمل میں لیتی ہے اور ان سب کو اصولِ دین کے ذریعے حل کرتی ہے۔ اُس نے دین و سیاست کے لئے ایک ہم آہنگ لٹریچر کی تخلیق کی ہے، اُس نے دو عملی قیادت بہم پہنچائی ہے، اُس نے ملک میں ایک نئی سوسائٹی پیدا کر دی ہے جو ثنویت کے زہریلے اثرات سے پاک ہے اور اُس نے ایک ایسی تحریک برپا کر دی ہے جس میں دین و سیاست کے تقاضے ایک دوسرے سے الگ نہیں رہے۔

لیکن یہ ایک عجیب صورتِ حالات ہے کہ ایک طرف ہمارا مغرب زدہ طبقہ جب اُس کے "دینی" پہلو کو محسوس کرتا ہے تو وہ یہ کہہ کر اُس سے کنی کاٹتا ہے۔ کہ یہ تو مذہبی لوگوں کی تنظیم ہے۔ اِن کو کیا معلوم کہ سیاست کیا ہوتی ہے اور آج کی دنیا کے کونسے مسائل ہیں جو حل طلب ہیں۔ دوسری طرف مذہبی حضرات جب اُس کی سیاسی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کو افسوس ہوتا ہے کہ اچھی بھلی دینی جماعت تھی لیکن چلتے چلتے سیاسی[1]

لہ قارئین کے لئے یہ حقیقت نہایت دلچسپ ہوگی کہ ایک مقام سے ہمیں اپنے رفقاء کی طرف سے یہ مستند رپورٹ کچھ عرصہ پہلے ملی تھی کہ سی۔ آئی۔ ڈی کے کارکن یہ کہتے پائے گئے کہ جماعت اسلامی تو اب دینی جماعت کے بجائے سیاسی پارٹی بن گئی ہے اور اب اس میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ ان حضرات کی اس رائے زنی کا اصل ہدف کیا ہے۔

دنیوی کے چکر میں جا پڑی۔

یہ دو مختلف گروہ ہیں جن کی طرف سے یہ دو مختلف باتیں اور ان کے ساتھ بہت سی تفصیلات کو سننے کا ہمیں بارہا موقع ملا ہے۔ لیکن ان دونوں گروہوں میں قدرِ مشترک دین و سیاست کی تفریق کا نظریہ ہے۔ پہلا گروہ اپنے دماغ میں یہ تصور لئے بیٹھا ہے کہ جہاں دین ہے وہاں سیاست نہیں ہو سکتی اور دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ جہاں سیاست ہو وہاں دین نہیں ہو سکتا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ غلط فہمی یہاں تک پہنچی ہے کہ دین کسی طرح سیاست نہیں ہو سکتا اور سیاست کسی طرح دین نہیں ہو سکتی۔ ایک عنصر جماعت اسلامی پر تاریک خیالی کا الزام لگاتا ہے اور دوسرا جدت پسندی کا۔ ایک ملائیت کا طعنہ دیتا ہے اور دوسرا تجدد کا، وہ ہمیں تھیوکریسی (Theocracy) کا علمبردار گردانتا ہے اور یہ جمہوری سیاست کا! ——— اور ان دونوں کے درمیان ہمارا حال وہی علامہ اقبال کا سا ہے کہ:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا   اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلمان ہوں میں

پہلے گروہ کو یہ نہیں معلوم کہ اسلام جتنا دین ہے اُتنا ہی سیاست بھی ہے، اور دوسرے گروہ کو یہ شعور حاصل نہیں ہے کہ اسلامی اصولوں پر جس سیاست کو چلایا جائے وہ جتنی سیاست ہوتی ہے، اتنی ہی دین بھی ہوا کرتی ہے۔ ہمارا اولی الفکر طبقہ دین کی ماہیت سے براہِ راست واقف نہیں ہے بلکہ اُس نے اپنا تصورِ مذہب مغرب سے حاصل کیا ہے، اس وجہ سے وہ دین و سیاست کی وحدت کے نظریے کی کسی عملی شکل و ہیئت کا نقشہ تک اپنے ذہن میں قائم نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں اس طبقے کے ہاتھ میں چونکہ غیر دینی نظامِ سیاست کا اقتدار بھی ہے اور وہ اسے بہر قیمت برابر اپنے قابو میں رکھنا چاہتا ہے، اس وجہ سے جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک دینی تحریک میدانِ سیاست کو فتح کرنے کے لئے آگے بڑھی چلی آرہی ہے تو وہ اس کی مزاحمت کرنے کے لئے پروپیگنڈے کے طور پر بہت سی ایسی باتیں پھیلاتا ہے جن کے متعلق اسے معلوم ہے کہ جماعت اسلامی ان سے پاک ہے اور وہ عام مذہبی انجمنوں کے سے تصورات لے کے نہیں چلی۔ یہ پروپیگنڈہ چونکہ ملک کے بہت بڑے بڑے افراد کے ذریعے وسیع اور تیز رفتار وسائل کے بل پر پھیلتا ہے اس سے بہت سے مخلص اور اسلام پسند نوجوان اس کی ساحری کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دوسرا طبقہ چونکہ دینِ